دین وایمان _ عبادت وعرفان

RELIGION & FAITH _WORSHIP & MYSTICISM

Dr. Shaikh.M.Hasnain

***Abstract*:**

This article attempts to highlight the concepts of religion, faith, worship and mysticism. According to the writer, it is very important for a Muslim researcher to have an analytic view of these topics. The topics may be analyzed from the viewpoint of religion itself, as well as from the viewpoint of philosophy, sociology and psychology. However, this article presents a detailed overview of these topics from "Inner Approach" and religious perspective.

Author has provided thoughtful discussions on the nature of religion, its essence and origin. The reality of faith, worship and mystics have been also discussed in details. According to the author, the end goal of religion is the worship of Almighty Allah and the mysticism is the most perfect kind of worship.

Keywords: *Religion, Faith, Nature, worship, mysticism.*

خلاصہ

زیر نظر مقالہ میں دین، ایمان، عبادت اور عرفان جیسے عناوین کے مفاہیم اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق ایک مسلمان محقّق کے لئے ان موضوعات کا تحلیلی جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ یہ جائزہ دین کے منظر سے بھی لیا جاسکتا ہے اور فلسفہ، سماجیات اور نفسیات وغیرہ کے منظر سے بھی لیا جاسکتا ہے۔ تاہم اس مقالہ میں ان موضوعات کا دین کے منظر سے تحلیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے اس مقالہ میں دین کی ماہیت، جوہر، سرچشمہ، دینداری اور ایمان کی حقیقت، نیز عبادت اور عرفان جیسے عناوین پر فکر انگیز مباحث پیش کی ہیں۔ ان کے مطابق دین ضوابط کا وہ مجموعہ ہے جس کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ و حکمت ہے۔ دین کی غرض و غایت عبادت ہے اور عبادت کا کمال عرفان میں ہے۔

کلیدی کلمات: دین، ایمان، فطرت، عبادت، عرفان۔

موضوع کی اہمیت

دین اور دینداری، تاریخِ بشریت کا زندہ موضوع ہے۔ ہر دور میں انسانوں کی ایک کثیر تعداد دیندار اور دین پرست رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ادیان کی حق و باطل میں تقسیم اور ایمان و الحاد کی کشمکش بھی انسانی تاریخ کے مسلّمات میں سے ہے۔ لہٰذا ایک انسان ہونے کے ناطے، انسانیت کے اس زندہ موضوع سے آشنائی، انسان کی حقیقت سے آشنائی اور اِس سے غفلت، خود فراموشی کے مترادف ہے۔ اِس موضوع پر بحث، اس لئے بھی اہم ہے کیونکہ ایمان اور الحاد کے معرکہ میں انسان بے طرف نہیں رہ سکتا اور اندھی تقلید بھی اُس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ لہٰذا دین و بے دینی اور ایمان و الحاد کے مفاہیم اور مصادیق کا محققانہ جائزہ لینا، ہر باشعور انسان کا فریضہ ہے۔ اس کے علاوہ، ایک دیندار کے منظر سے بھی اس موضوع سے گہری آشنائی ضروری ہے۔ تاکہ اپنے دین و ایمان کا منطقی دفاع اور دینداری کا وہ تقاضا پورا کیا جاسکے جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ (3:109-110) یعنی: "آسمانوں وزمین میں جو کچھ ہے، یہ سب اللہ کی ملکیت ہے اور تمام امور کی بازگشت اللہ کی طرف ہے۔ تم ہی وہ بہترین اُمّت ہو جسے بشریت کے لئے نکالا گیا ہے، تم معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا، ان میں کچھ صاحبان ایمان بھی ہیں، لیکن اکثر فاسق ہیں۔"

اس آیت کی رو سے اسلام کی منطق یہ ہے کہ زمین وآسمان اور ان کے مابین سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے:

ع "ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست۔"

یعنی: "ہر ملک، ہمارا ملک ہے؛ کیونکہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔"

لہٰذا اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے امتِ مسلمہ زمین وآسمان کی مالک، اُس کے ماحولیات کی حفاظت کی ذمہ دار اور پوری انسانیت تک خیر و نیکی کا پیغام پہچانے والی اور شرّ اور فساد سے بچانے والی ہے۔ بدقسمتی سے مستشرقین نے بلادِ اسلامیہ پر غلبے کی راہیں ہموار کرنے کی غرض سے صدیوں پر محیط استشراقی مطالعات انجام دیے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہم نے اپنے دین کا مطالعہ کیا، نہ دیگر ادیان پر غور فرمایا۔ اگرچہ اسلام مالِ غنیمت جمع کرنے اور کشور کشائی کی غرض سے ہر حرکت بشمول دعوت دینیہ کی بھی شدّت سے نفی کرتا ہے، لیکن گمراہوں کی ہدایت کے لئے دین کا نسخہ ہر خطہٗ عالم میں پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ لیکن یہ ذمہ داری انجام دینے کے لئے دین و دینداری کے موضوع کا گہرا مطالعہ، انسانی مطالعات کا انتہائی اہم موضوع ہے جس پر ہر زمانے کے

مسلمان مفکرین کی جاندار مباحث کی اشدّ ضرورت ہے۔ کیونکہ ہر دَور میں یہ سوال اٹھتے ہیں کہ دین، انسان کے کس درد کی دوا ہے اور یہ معاشرے کی کونسی مشکلات حل کر سکتا ہے۔ حتی اگر ایسے سوالات درپیش نہ بھی ہوں، تب بھی دین ودینداری کے موضوع پر ہر دَور میں تحقیق ضروری ہے۔ کیونکہ: "اوّلا، دینی حقائق اور تعلیمات تہ بہ تہ ہیں اور کسی ایک زمانے کے محقق کے لئے ان کی تمام تہوں اور سطوح تک پہنچنا ناممکن ہے۔۔۔ ثانیا، خود انسان کی حقیقت بھی کئی مراتب اور درجات میں پھیلی ہوئی ہے اور ایک عصر کے انسان کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ہر عصر کے انسان کی ضروریات کشف کرسکے۔ خلاصہ یہ کہ ہر عصر کے علمائے دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عصر کی ضروریات کو کشف کرنے کے ساتھ ساتھ دینی تعلیمات کی نئ تطبیقات ڈھونڈیں۔"[1]

تحقیق کی روش

دین ودینداری کے موضوع پر تحقیق سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنی روش کا تعین کرلیں۔ کیونکہ اس موضوع پر تحقیق کے دوران دو بنیادی روشیں اپنائی جا سکتی ہیں۔ ایک، "داخلی روش" اور دوسری، "خارجی روش"۔ داخلی روش Inner Approach میں ایک محقّق، خود دین سے پوچھتا ہے کہ دین کیا ہے؟ کیوں آیا ہے اور اس کے پاس بنی نوع بشر کے کس درد کی دوا ہے؟ لیکن خارجی روش Outer Approach میں دین ودینداری کے فلسفی، نفسیاتی اور سماجی عوامل اور اسباب تلاش کیے جاتے ہیں اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ کن انگیزوں کے تحت دیندار بنتے ہیں؟ دوسرے الفاظ میں، دین کے مطالعہ کی خارجی روش میں انسان، دین کی شناخت بتاتا ہے۔ جبکہ داخلی روش میں دین، انسان کی شناخت بتاتا ہے۔ اگرچہ دین ودینداری کی تبلیغ وترویج اور اس کے مضبوط دفاع کے لئے "خارجی روش" کے زاویے سے بھی اس موضوع کا مطالعہ بہت ضروری ہے، لیکن اس مقالہ میں ہم بیشتر Inner Approach کا سہارا لیں گے۔ اس کی عمدہ وجہ یہ ہے کہ اسلام جیسے آسمانی، الٰہی دین کی ماہیت، جوہر، عناصر اور دائرہ کار کی تشخیص کے لئے تنہا خارجی روش اپنانا ایسے ہی ہے جیسے کسی عمارت سے باہر کھڑے ہو کر اس کی اندرونی فضا اور استحکام کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنا۔ یقیناً ایسی قیاس آرائیاں اکثر نادرست اور گمراہ کن ثابت ہوتی ہیں۔

ماہیت اور تعریف

کسی چیز کے بارے میں What is (ما ھو) کا سوال پوچھے جانے پر دیئے جانے والے جواب کو اس چیز کی "ماہیت" کہا جاتا ہے۔ اشیاء کی ماہیت کا پتہ ان کی تعریف سے چلتا ہے۔ لیکن دین کے معاملہ میں مشکل یہ درپیش ہے کہ دین کی ماہوی تعریف بیان نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ بعض محققین کے مطابق دین چند عقیدتی، اخلاقی، فقہی اور عدالتی احکام کے مجموعہ کی حیثیت سے "حقیقی وحدت" کا فاقد ہے اور یہ امر منطق دانوں کے لئے

ثابت شدہ ہے کہ جس چیز میں حقیقی وحدت نہ پائی جاتی ہو، اس کی جنس و فصل نہیں ہوتی اور جس چیز کی جنس و فصل نہ ہو اس کی ماہوی تعریف (حدّ تام، حدّ ناقص) بیان نہیں کی جاسکتی۔ پس دین کی حقیقی تعریف ناممکن ہے۔[2] تاہم پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ نہ فقط دین، بلکہ عالمِ ہستی کے بے شمار مظاہر کی جنس و فصل ڈھونڈی جاسکی ہے، نہ ان کی ماہوی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اس کے باوجود، ان اشیاء کے مفاہیم ہمارے اذہان میں واضح ہیں جن کی مدد سے ہم انہیں دیگر اشیاء سے جدا کرتے اور ان کے ساتھ اپنے معاملات نبھاتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے دین کا مفہوم واضح ہونا چاہیے جس کے لئے دین کی مفہومی تعریف کافی ہے۔ استاد محمد تقی جعفری کی طرف منسوب دین کی مفہومی تعریف یہ ہے : "دین اُن علمی اور عملی ہدایات کے مجموعہ کا نام ہے جو وحی و سنّت کے ذریعے انسان کی دنیا وآخرت کی فلاح و نجات کے لئے اترا ہے۔"[3] اسی طرح علامہ جوادی آملی کے مطابق: "دین، ایسے عقائد، اخلاق، قوانین اور احکامات کے مجموعہ کا نام ہے جو فرد اور معاشرے کا نظام چلانے اور انسانوں کی بذریعہ وحی پرورش کے لئے اُن کے سپرد کیا جاتا ہے۔"[4]

جوہر اور سرچشمہ

دین کے 5 بنیادی عناصر ہیں جو دین کا جوہر تشکیل دیتے ہیں:

1. اس عالم میں ایک برتر اور تعالیٰ ہستی موجود ہے جو صاحب حیات و علم و قدرت وارادہ ہے۔
2. امور عالم کی تدبیر اس تعالیٰ ہستی کے ہاتھ میں ہے۔
3. یہ مقدس اور برتر ذات اپنے کمال اور ربوبیّت کی وجہ سے اطاعت و بندگی کے لائق ہے۔
4. اس مقدس ہستی نے انسانوں کے ساتھ رابطہ برقرار کیا ہے اور انہیں زندگی گزارنے کا مکمل ضابطہ دیا ہے۔
5. جزا یا سزا کے لئے ایک دن (قیامت) معین ہے اور انسان دنیا کی زندگی میں جیسا طرزِ عمل اپنائے گا، قیامت کے دن اِس تعالیٰ (بلند مرتبہ) ہستی سے ویسا بدلہ پائے گا۔

جس دین میں یہ پانچ ارکان ایک ساتھ پائے جائیں وہ آسمانی دین ہے۔ بنابریں، دین، مخصوص الٰہی علم اور ربّانی مشیّت کے تحت انسان کی ہدایت، تکامل اور فلاح کے لئے تجویز شدہ اُس نسخے کا نام ہے جو لوح محفوظ پر ایک عینی حقیقت کے طور پر نقش ہے۔[5] دین کا سرچشمہ، اللہ تعالیٰ کا علم، حکمت، تدبیر اور ارادہ ہے اور دین اپنے سرچشمہ سے ایک دائمی فیض کی صورت میں وحی و نبوّت کے ذریعے عرش سے فرش کی جانب رواں دواں ہے اور حضرت آدمؑ سے لے کر جناب خاتم ﷺ تک انبیائے الٰہی کے لائے ہوئے ادیان کی صورت میں ایمان و بندگی کی اساس فراہم کر رہا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں نوح و ابراہیم و اسحاق و یعقوب و داود و سلیمان و ایوب و یوسف و موسیٰ و

ہارون اور زکریا و یحییٰ و عیسیٰ والیاس واسماعیل ویسع و یونس ولوط اور ان کے اجداد و اخلاف سے سب انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ ہستیاں تھیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے زمانے کے تمام لوگوں پر فضیلت بخشی اور انہیں ہدایت کا فیض عرش سے فرش تک لانے کی ذمہ داری سونپی: وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ (6:84-89) یعنی: "اور ہم نے انہیں چن لیا اور انہیں سیدھی راہ کی طرف ہدایت فرمادی ۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کے ذریعے رہنمائی فرماتا ہے اور اگر یہ لوگ شرک کرتے تو ان کے سارے اعمال نیست و نابود ہو جاتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکم (شریعت) اور نبوّت عطا فرمائی۔ پھر اگر یہ لوگ (یعنی کافر) ان باتوں کا انکار کر دیں تو بے شک ہم نے اِن (کتاب، حکم، نبوت) پر (ایمان لانے کے لیے) ایسی قوم کو مقرر کر دیا ہے جو ان کا انکار کرنے والے نہیں (ہوں گے)۔" پس دین کا سرچشمہ خدا ہے اور دین ایک فیض ہے جو بارگاہ ربوبی سے خدا کے منتخب بندوں کے توسط سے کتاب، شریعت اور نبوّت کی شکل میں جاری ہے اور بنی نوع بشر کو سیراب کر رہا ہے۔

ایمان اور فطرت

عام طور پر "ایمان" یا دینداری کو "دین" کا مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں فرق ہے۔ کیونکہ دین، ایک نفس الامری حقیقت ہے جو لوح محفوظ پر نقش الٰہی علم، ارادہ، حکمت اور تدبیر سے عبارت ہے۔ لیکن ایمان یا دینداری ایک بشری کیفیت اور تصورِ کائنات ہے جو انسان کی لوح دل پر نقش ہوتا ہے۔ ایمان کے 5 بنیادی ارکان ہیں:

1. یہ عقیدہ کہ اس عالم میں ایک برتر اور تعالیٰ ہستی موجود ہے جو صاحب حیات و علم و قدرت و ارادہ ہے۔
2. یہ عقیدہ کہ انسان اور کائنات کی پرورش اور امورِ عالم کی تدبیر اس تعالیٰ ہستی کے ہاتھ میں ہے۔
3. یہ عقیدہ کہ یہ مقدس اور برتر ذات لامتناہی کمال کی مالک اور اطاعت و بندگی کے لائق ہے۔
4. یہ عقیدہ کہ اس برتر ذات نے انسانوں کو زندگی گزارنے کا مکمل ضابطہ دیا ہے۔
5. یہ عقیدہ کہ اِس ضابطہ کی پابندی ضروری ہے اور انسان دنیا میں اِس ضابطۂ حیات کے متعلق جیسا طرزِ عمل اپنائے گا، قیامت کے دن خدا کی بارگاہ سے ویسا بدلہ پائے گا۔

جس تصور کائنات میں یہ پانچ عناصر ایک ساتھ پائے جائیں وہ ایمان ہے۔ بنابریں، دین اور ایمان کا ظریف فرق یہ ہے کہ جب دین لوح محفوظ سے اتر کر انبیاء علیہم السلام کے ذریعے قلبِ بشر پر نقش ہوتا ہے تو "ایمان" کہلاتا ہے۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے ایک انتہائی مضبوط رسّی کا تصور کریں جو عرش و فرش کے درمیان لٹکی ہوئی ہے۔ اگر اِس

رسّی کو نزولی حالت میں دیکھا جائے تو یہ "دین" ہے اور اگر اسے صعودی حالت میں دیکھا جائے تو یہ "ایمان" ہے۔ دوسرے الفاظ میں "دین" خدا کا علم، ارادہ اور مشیّت ہے؛ جبکہ "ایمان" انسان کا علم، ارادہ اور اختیار ہے۔ لہٰذا دین اور ایمان میں " قاب قوسین او ادنیٰ "کا فاصلہ ہے۔ مع الوصف، ایمان کا سرچشمہ، انسان کی پاک فطرت اور سلیم عقل ہے۔ فطرت آلودہ نہ ہو اور عقل میں خلل نہ ہو تو ناممکن ہے کہ انسان دیندار نہ ہو۔ انسان چاہے غار میں زندگی گزار رہا ہو یا سماج میں، ہر حال میں دیندار ہو گا۔ اور اگر ماحول، معاشرہ اور تربیت کی گرد و خاک اس کی لوح دل اور میزانِ عقل کو آلودہ کر بھی دے تو معمولی سی جھاڑ پھٹک سے اس کا دینداری کا جوہر نکھر کر سامنے آجائے گا۔

دین کے سرچشمہ کے عنوان کے تحت جن آیات کا اوپر ذکر ہوا ہے یہ آیتِ فطرت کے ذیل میں آئی ہیں۔ آیتِ فطرت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُس داستان کا بیان ہے جس کا لبّ لباب یہی ہے کہ انسان کی توحیدی فطرت اُس کے ایمان کا سرچشمہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تقریباً 16 سال کی ابتدائی زندگی غار میں گزاری۔ آپ اپنی سالم فطرت کی بنیاد پر ایک توحید پرست کی حیثیت سے سماج میں آئے اور اپنی مشرک قوم سے جب سامنا ہوا تو ایک حکیمانہ روش کے تحت آپ نے انہیں توحید کی دعوت دی۔ جب آپ نے رات کے وقت ایک چمکتا ستارہ دیکھا تو کہا: " هٰذَا رَبِّيْ" یعنی: "یہ میرا پروردگار ہے۔" دوسرے الفاظ میں آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میں پالا گیا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ میرا پالنے والا کون ہے؟ یہی ستارہ ! لیکن جب دیکھا کہ یہ ستارہ ڈوب گیا اور اُس میں بھی یہ خصلت نظر آئی کہ وہ خود کسی کا پالا ہوا ہے تو اعلان کیا کہ "میں ڈوبنے والے کو بطور "ربّ" پسند نہیں کر سکتا۔ اب جو چاند دیکھا تو کہا: " هٰذَا رَبِّيْ" یعنی: "یہ میرا پروردگار ہے!" کیونکہ یہ بہت روشن اور درخشندہ ہے۔ لیکن جب چاند بھی ڈوب گیا تو عقل سلیم اور پاک فطرت کے حکم پر یہ فتویٰ جاری کیا کہ اگر میرے حقیقی پروردگار نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں بھٹک جاوں گا۔ پھر جگمگاتا سورج دیکھا تو کہا کہ یہ ان سب سے بڑا ہے، گویا یہی میرا پالنے والا ہے۔ لیکن جب اسے بھی ڈوبتے دیکھا تو اعلان کر دیا: يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (6:76-79) یعنی: "اے میری قوم! میں تمہارے مشرکانہ عقائد سے بیزار ہوں۔ میں نے تو اُس ہستی کی طرف رخ کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو عدم سے خلق فرمایا ہے اور میرا مشرکین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

بنابریں، ایمان کا سرچشمہ، انسان کی پاک فطرت اور عقلِ سلیم ہے۔ لیکن یہ سرچشمہ بذات خود، خدا کا جاری کردہ ہے۔ لہٰذا دین، دینداری اور ایمان سے بے ربط نہیں اور ایمان، دین سے بے ربط نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ

ہے: "وَتِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَيْنٰهَاۤ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (6:83) یعنی: "اور یہی ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کی (مخالف) قوم کے مقابلہ میں دی تھی۔ ہم جس کے چاہیں درجات بلند کر دیتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب بڑی حکمت والا، خوب جاننے والا ہے۔" اس آیت میں دینداری اور ایمان کے فطرت کے ساتھ اِس گہرے رابطہ کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ نیز دین کی طرف دعوت کو، فطرت کی طرف رجوع کے مساوی قرار دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (30:30) یعنی: "پس آپ کامل یکسوئی کے ساتھ اپنا رخ دین کی طرف مرکوز رکھیں؛ اللہ کی اس فطرت کی طرف جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے؛ اللہ کی پیدا کردہ (فطرت) میں کوئی تبدیلی نہیں ہے؛ یہی محکم دین ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔" پس دینداری اور ایمان کا سرچشمہ یہی توحیدی فطرت ہے جو ہر دور کے انسان کے رویوں پر حکمرانی اور ایمان کی لازوال داستان رقم کرتی رہی ہے۔ یہ ہمیشہ سے گونجتی وہ اذان ہے جو پانچ ہزار سال قبل مسیح، "اہوار مزدا" کے نام پر ایک عقلِ کل، لافانی اور غیر مخلوق خالق کی بندگی کی صورت میں تو 1380 سال قبل مسیح، مصر میں اخناطون (Akhnaton) کے عصر میں "عاطون" (زندگی دینے والا) کی پرستش کی صورت میں گونجتی رہی ہے۔

جاودانگی اور جامعیت

اس میں شک نہیں کہ اکثر آسمانی ادیان منسوخ اور ناپید ہو چکے ہیں۔ یہودیت اور عیسائیت میں تحریفات ہو چکی ہیں۔ لیکن اسلام، ایک ایسا دین ہے جو اپنی اصیل حالت میں موجود ہے۔ اسلام کی جاودانگی کا راز یہی ہے کہ یہ ایک طرف، انسان کی فطرت میں جڑیں گاڑھے ہوئے ہے۔ اور چونکہ کسی چیز سے اس کی فطرت جدا نہیں ہو سکتی، لہٰذا انسان و انسانیّت جب تک باقی ہے، اسلام جاودانی ہے۔ دوسری طرف، اسلام کا سرچشمہ عرشِ الٰہی، لوحِ محفوظ اور خداوند تعالیٰ کا ازلی ارادہ ہے۔ خدا کا ارادہ اور وعدہ یہ ہے کہ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (9:15) یعنی: "بے شک ہم نے ذکر نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔" پس اسلامی تعلیمات کا بنیادی منبع یعنی قرآن کریم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہر طرح کی تحریف سے محفوظ ہے اور سینکڑوں اسلامی احکام آج بھی ضروریاتِ دین شمار ہوتے ہیں۔ لہٰذا دین اسلام کو دیگر ادیان پر یہ برتری حاصل ہے کہ یہ جاودانی دین ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام ایک کامل اور جامع دین ہے جو انسان کے نطفہ کے انعقاد سے لے کر اس کی تدفین تک، زندگی کے تمام شعبوں اور مسائل میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسلامی احکام انسانی زندگی کے فردی مسائل سے لے کر اس کے اجتماعی مسائل،

سب پر محیط ہیں۔ اسلام نے انسانی بدن سے لے کر اس کی روح اور نفس تک کے مسائل میں انسان کی بہترین رہنمائی کی ہے۔ اسلام کی سی جامعیت ہمیں کسی دین میں نظر نہیں آتی۔ اسلام کی جامعیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یہ ہر خطے اور ہر نسل کے انسانوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اسلام ہر زمانے کے حالات اور شرائط کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اسلام ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اپنی رہنمائی کی ضیاء پاشیاں کر رہا ہے۔ اسلامی فقہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے کسی دور کے انسان کا کوئی مسئلہ فروگذار نہیں کیا اور زندگی کے ہر شعبہ سے مربوط مسائل میں رہنمائی کی ہے۔ اسلام کی جامعیّت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ یہ خانقاہ تک محدود نہیں۔ یہ مسجد و مدرسہ دونوں میں ہے۔ یہ کُنج خانہ سے لے کر کوچہ و بازار میں رہنمائی فراہم کرتا اور انسان کی دنیا و آخرت کے درمیان ایک حسین امتزاج قائم کرتا ہے۔ اسلام انسان کو دنیا اور دنیاوی مواہب سے نہیں روکتا اور دنیا کو آخرت کے کسب کرنے کا بہترین وسیلہ قرار دیتا ہے۔ اسلام کی تاکید یہ ہے کہ: "وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا" (77:28) یعنی: "اور تو اس (دولت) سے جو اللہ نے تجھے دے رکھی ہے، آخرت کا گھر طلب کر اور دنیا سے (بھی) اپنا حصہ نہ بھول۔"

عبادت

دین کی غرض و غایت بنی نوعِ بشر کی نجات اور اُسے منزلِ مقصود تک پہنچانا ہے۔ انسانیّت کی منزل "عبادت" ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (56:51) یعنی: "میں نے جن وانس کو بس اپنی عبادت کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔" لہٰذا، دین انسان کے دل میں ایمان کا بیج بوتا اور "عبادت" کی فصل اٹھاتا ہے۔ لیکن سوچنا یہ ہے کہ عبادت کیا ہے؟ بدقسمتی سے عبادت کا مفہوم، بہت کم اجاگر کیا گیا ہے۔ اسے کہیں خوف، تو کہیں جہل کا جلوہ، کہیں آباء واجداد کی اندھی تقلید، تو کہیں رسم ورواج قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ عبادت، نہ خوف ہے، نہ جہل، نہ رسم ہے، نہ تقلید، بلکہ سکون واطمینان کی ایک کیفیت اور اطاعت و تعظیم ہے۔ یہ سراسر بصیرت اور عرفان ہے۔ اور اس کی بنیادی شرط، معبود کی معرفت اور پہچان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ یہ ویسے انجام دی جائے جیسے صاحبِ شریعت نے تعلیم دی ہے۔ اس میں کسی قسم کا من پسند دخل و تصرف ممنوع ہے۔ عبادت کی تیسری شرط خلوص ہے۔ یہ خالصتاً، معبود کی رضا اور اس کے حکم کی بجاآوری کی نیّت اور انگیزے کے تحت بجالائی جائے اور اس میں کسی قسم کا دکھاوا، ریاکاری اور غیر خدائی ہدف کارفرمانہ ہو۔

بنابریں، جس عمل میں یہ بنیادی تین شرائط پائی جاتی ہوں، وہ عبادت ہے۔ تاہم، عبادت کے کئی درجات اور مراتب ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کے فرمان کے مطابق: انّ قوما عبدوا الله عزّوجل رهبة، فتلك عبادة العبيد،

و آخرين عبدوالله رغبة، فتلك عبادة التجار، و آخرين عبدوه شكرا فتلك عبادة الأحرار[6] یعنی: "کچھ لوگوں نے خوف کی وجہ سے اللہ عزوجلّ کی عبادت کی۔ سو یہ غلاموں کی بندگی ہے۔اور ایک قوم نے لالچ میں اللہ کی عبادت کی۔ سو یہ تاجروں کی سوداگری ہے۔ اور ایک قوم نے اُس کا شکر بجالانے کے لئے عبادت کی۔ سو یہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے۔" اِس فرمان کی روشنی میں عبادت کے تین انگیزے ہو سکتے ہیں۔پہلا انگیزہ، آخرت کے عذاب اور جہنم کا خوف ہو سکتا ہے۔اِس انگیزہ کے تحت خدا کی پرستش،غلاموں کی عبادت ہے۔ البتہ اس کے عبادت ہونے کی نفی نہیں کی گئ اور ایسے عمل کا معاملہ نافرمانی، عصیان اور ریاکاری وغیرہ سے جدا ہے۔ عبادت کا دوسرا انگیزہ، آخرت کی نعمتوں اور بہشت کی لالچ ہو سکتا ہے۔اِس انگیزہ کے تحت خدا کی پرستش، تاجروں کی سوداگری ہے۔ لیکن یہ بھی عبادت ہے اور اس کے عبادت ہونے کی نفی نہیں کی گئ۔

عبادت کا تیسرا انگیزہ شکر ہے۔ انسان جب اپنے وجود و ہستی، اپنی تمام تر توانائیوں اور اُن تمام نعمتوں پر غور کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی ہیں تو وہ ان نعمتوں کا شکر بجالانا ضروری سمجھتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی معروف دعائے عرفہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین اور توحید کو جہاں نعمت قرار دیا ہے وہاں اپنی آنکھوں کے عدسوں اور دماغ سے ملے رستوں، پیشانی کے نقوش، سانس کی نالیوں، ناک کے نرم وملائم پردوں، کانوں کی جھلیوں، حرکت کرتے ہونٹوں، زبان کی حرکت، منہ کے جبڑوں کا کھلنا اور بند ہونا، دانتوں کا اُگنا، قوت ذائقہ، دماغ کی قرار گاہ، گردن کی غذا کی نالیوں، سینے کی ہڈیوں، شہ رگ حیات، دل کے پردوں، جگر کے لٹکے کناروں، باہم جڑی ہوئی پسلیوں، بدن کے اعضاء کے جوڑوں، انگلیوں کے پوروں، گوشت،خون، بالوں اور جلد، بدن کے پٹھوں، مہروں اور ہڈیوں، رگوں، گوشت اور جلد،اور نیند اور بیداری،اور سکون اور رکوع و سجود کی حرکات، ان سب کو اللہ تعالی کی نعمتیں شمار کرتے ہوئے ان کے شکر کو واجب قرار دیا ہے اور اعتراف کرتے ہیں کہ "اگر میں عمروں اور نسلوں بھر کوشش اور بھرپور محنت کروں؛ بشرطیکہ مجھے اتنی لمبی عمر عطا بھی کردی جائے، اور میرے ساتھ سب گننے والے بھی مل جائیں اور تیری نعمتوں میں سے کسی ایک نعمت کا شمار اور شکریہ ادا کرنا چاہیں تو ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے حالانکہ تو نے اپنی سچی کتاب اور سچی خبر میں خبر دی ہے: "اور اگر تم اللہ کی ایک نعمت کا شمار کرنا چاہو تو بھی اس کا احاطہ نہیں کرسکتے۔"[7]

بنابریں، اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کا شکر بجالانے کی وہ صورت جو شریعت نے بتائی ہے، عبادت کہلاتی ہے۔ قرآن کریم کی بعض آیات میں ایمان اور دینداری کو شکر کا مصداق قرار دیا گیا ہے(3:76) تو بعض دیگر میں نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے جیسے عبادی اعمال کو شکر ادا کرنے کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شکر، عبادت میں اور عبادت، شکر کے انگیزے سے تحقق پاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُل لِّعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُواْ يُقِيمُواْ

الصَّلاَةَ وَيُنفِقُواْ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلانِيَةً مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لاَّ بَيْعٌ فِيهِ وَلاَ خِلاَلٌ اللّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ۔۔۔ (14:31-34) یعنی: "آپ میرے مومن بندوں سے فرمادیں کہ وہ نماز قائم رکھیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور اعلانیہ (ہماری راہ میں) خرچ کرتے رہیں اس دن کے آنے سے پہلے جس دن میں نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی اور نہ ہی کوئی دوستی (کام آئے گی)، اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور آسمان کی جانب سے پانی اتارا پھر اس پانی کے ذریعہ سے تمہارے رزق کے طور پر پھل پیدا کئے اور اس نے تمہارے لئے کشتیوں کو مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی رہیں اور اس نے تمہارے لئے دریاؤں کو (بھی) مسخر کر دیا اور اس نے تمہارے فائدہ کے لئے سورج اور چاند کو مطیع بنادیا جو ہمیشہ (اپنے اپنے مدار میں) گردش کرتے رہتے ہیں، اور تمہارے (نظامِ حیات کے) لئے رات اور دن کو بھی (ایک نظام کے) مسخر کر دیا اور اس نے تمہیں ہر وہ چیز عطا فرمادی جو تم نے اس سے مانگی۔ اور اگر تم اللہ کی ایک نعمت کو شمار کرنا چاہو تو پورا شمار نہ کر سکوگے۔ بے شک انسان بڑا ہی ظالم بڑا ہی ناشکر گزار ہے۔"

عرفان

جس طرح دین کی حقیقی تعریف ناممکن ہے، اسی طرح عرفان کی تعریف بھی ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں، عرفان کی مفہومی تعریف بھی محلِ اشکال ہے۔ کیونکہ عرفان، درحقیقت، ایک ایسی نفسانی کیفیت کا نام ہے جس سے ایک عارف گذرتا ہے۔ لہٰذا جب تک ایک شخص خود اِس حالت سے نہ گزرے، اُسے الفاظ و مفاہیم کی مدد سے اِس حالت سے آگاہ نہیں کیا جاسکتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اُس شخص کو خوف کا مطلب نہیں سمجھایا جاسکتا جو کبھی خوف کے عالم سے نہ گزرا ہو۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

تا قیامت زاہد ارمے مے کند　　　　تا نئوشد بادہ مستی کے کند؟

یعنی: "اگر زاہد قیامت تک شراب، شراب کی رٹ لگاتا رہے، جب تک شراب کا جام نہ چڑھالے مست نہ ہوگا۔"

بہر صورت، اگر عرفان کی تعریف میں کچھ کہنا ناگزیر ہو تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ معرفت ہے جس میں عارف کائنات میں تنہا ایک یکتا حقیقت کو پاتا اور کائنات کی ہر چیز کو اُسی کے نور کا ظہور اور تجلی دیکھتا ہے۔

ہر چہ از کائنات گیرد رنگ　　　　جملہ در خاک پاش می بینم

یعنی: "کائنات میں جس چیز میں کوئی رنگ نظر آتا ہے، مَیں اِن سب چیزوں کو اُس کی خاکِ پا میں دیکھتا ہوں۔"[8]

بہر صورت، عرفانی نکتۂ نگاہ سے عبادت، نہ خوف کے انگیزے سے، نہ تجارت کی غرض سے اور نہ شکر بجالانے کے لئے، بلکہ از روئے عشق و شوق انجام پاتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کافرمان ہے: إلھی ما عبدتك خوفا من عقابك، ولا رغبة فی ثوابك، ولكن وجدتك أهلا للعبادة فعبدتك[9] یعنی: "بار الہا! میں نے تیرے عقاب کے خوف میں، نہ تیرے ثواب کے شوق میں تیری بندگی کی ہے؛ بلکہ میں نے تجھے بندگی کے لائق پایا ہے پس میں نے تیری بندگی کی ہے۔" نیز آپؑ کافرمان ہے: ما کنت أعبد ربّا لم أره[10] یعنی: "میں ایسے ربّ کی عبادت کرنے والا نہیں ہوں جسے میں نے دیکھا نہ ہو۔" اس امر کی تحلیل یہ ہے کہ عبادت، ایک اختیاری عمل ہے جس کا سرچشمہ انسان کا ارادہ و اختیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلوب الارادہ شخص سے عبادت کا تحقق ناممکن ہے اور دیوانے، بے ہوش اور مدہوش پر عبادت نہ واجب ہے، نہ درست: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (43:4) یعنی: "تم نشے اور مدہوشی کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاو۔" لہٰذا عبادت کے وجوب اور صحت کی شرط، اراہ واختیار ہے۔ دراصل، آزاد انسان کا کوئی ارادی فعل، اُس کے اختیار کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ لیکن اختیار، ارادہ کے بغیر تحقق نہیں پا سکتا۔ اور ارادہ بذات خود، میل و رغبت کے بغیر تحقق نہیں پا سکتا۔ لیکن انسان کے اندر اُس وقت تک کسی چیز کی طرف میل و رغبت اور کشش ایجاد نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُس چیز میں حسن نہ پایا جاتا ہو۔ لہٰذا ایک عاقل اور صاحب اختیار و ارادہ انسان کی ہر حرکت کا عامل، حسن و جمال ہے۔ اور اگر بظاہر کہیں کسی حرکت کا عامل، کسی رنج والم سے فرار ہو تو وہاں بھی دراصل انسان جس چیز کی طرف فرار کرتا ہے، اُس میں اُسے حسن و جمال نظر آتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حسن، حرکت ایجاد کرتا ہے۔ کسی شاعر کے بقول:

ؔ میری طرح سے یہ مہر ماہ بھی ہیں آوارہ کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

لیکن سوال یہ ہے کہ حسن کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ حسن بذاتِ خود کچھ نہیں، یہ تو کمال کی ترجمانی کا نام ہے۔ لہٰذا جس چیز میں کمال نہ ہو، اُسے حسن و رعنائی کی سند نہیں ملتی۔ جس میں حسن نہ ہو، وہ کشش اور رغبت ایجاد نہیں کر سکتا۔ جو شوق و رغبت ایجاد نہ کر سکے وہ ارادے کا محرّک نہیں بن سکتا۔ جس کا ارادہ تحقق نہ پا سکے، انسان اُسے اختیار نہیں کرتا اور جسے اختیار نہ کرے، اُسے انجام نہیں دے سکتا۔ دوسری طرف، کمال کو جلوہ پسند ہے۔ جلوہ، جمال کی صورت میں تجلی دکھاتا ہے۔ تجلی، عشق و رغبت اور وصال کی تڑپ ایجاد کرتی ہے۔ اور تڑپ، ارادہ اور نیّت تشکیل دیتی ہے جو ذاکر کو ذکر، عامل کو عمل اور عاشق کو وصال کے سفر پر ابھارتی ہے۔ بنابریں، ایک بااختیار وصاحبِ ارادہ انسان کے ہر ارادی عمل میں انجام کا کمال اور اِس کمال کا ادراک پوشیدہ ہے۔ اور چونکہ عبادت بھی ایک ارادی عمل ہے، اِس میں یہ دونوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی ہستی "الصمد" ہے۔ صمد

اُسے کہتے ہیں جس میں کوئی کمی نہ ہو۔ اور جس میں کوئی کمی نہ ہو وہ کمالِ مطلق ہے۔ کمال کی فطرت میں تجلّی ہے: کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لاعرف[11] یعنی: "میں ایک چھپا خزانہ تھا، سو میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں۔ لہٰذا میں نے مخلوقات کو خلق کیا تاکہ پہچانا جاؤں۔" بعض مفسرین نے آیہ کریمہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" میں لِيَعْبُدُونِ کی تفسیر "ليعرفونی" یعنی "مجھے پہچانیں" کی ہے۔

دوسری طرف، انسان کا کمال اور حسن سے عشق فطری ہے۔ امام خمینی کے بقول: "ہر انسان کا دل ایک ایسے کمال کی تلاش میں ہے جس میں کوئی نقص نہ ہو اور سب لوگ ایک ایسے کمال کے عاشق ہیں جس میں کوئی عیب نہ ہو، ایک ایسے علم کے عاشق ہیں جس کے ہمراہ جہل نہ ہو، ایک ایسی قدرت و سلطنت کے عاشق ہیں جس میں عجز و ناتوانی نہ ہو، ایک ایسی زندگی کے عاشق ہیں جس میں موت نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ کمالِ مطلق کے سب عاشق ہیں۔"[12] لہٰذا جہاں شمع اور پروانہ، دونوں اکٹھے ہوں وہاں ساز و سوز اور عشق و گداز لا محالہ ہے۔ پس کمالِ مطلق کے جمال کی تجلّی اپنے نظارہ گر میں عشق و مستی اور جذب و جنون کی کیفیت ایجاد کرتی ہے اور ایک عارف جب اللہ تعالیٰ کے کمال و جمال کی تجلّی دیکھتا ہے تو اُس کے اندر عشق و شوق، میل و رغبت اور ارادہ ایجاد ہوتا ہے اور وہ "قربۃً الی اللہ" کی نیّت سے لقاء اللہ کے سفر پر نکل پڑتا ہے۔

؎ جو دیکھتے تیری زنجیرِ زلف کا عالم اسیر ہونے کی آزاد، آرزو کرتے

یہی بات صائن الدین اصفہانی نے ضوء اللمعات میں کہی ہے۔ ڈاکٹر ابراہیمی دینانی کے بقول، صائن الدین اصفہانی کے مطابق علم عرفان کا موضوع ایک ایسی حقیقتِ واحدہ ہے جو ہر قسم کے تعیّن اور تمیّز سے منزہ ہے۔ لیکن جب عالم اطوار اور جہانِ ادوار میں اِس واحد حقیقت کا معتبر اعتبار کرتا ہے تو اُسے اِس حقیقت کے دو عمدہ اثر نظر آتے ہیں: ایک، ظہور و اظہار؛ اور دوسرا، شعور و اشعار۔[13] صائن اصفہانی کے اِس کلام کا معنی یہ ہے کہ "ظہور و اظہار" سے عالمِ مُلک و ملکوت میں تجلّی اور آیات نمودار ہوتی ہیں اور "شعور و اشعار" سے عالمِ مَلک، عالمِ جنّ اور عالمِ انس میں عشق و عرفان ایجاد ہوتا ہے جو عارف کی صراطِ مستقیم بن جاتا ہے جس پر چل کر وہ ہر قسم کی گمراہی اور ضلالت سے نجات پاتا ہے۔ حضرت امام سجادؑ کے الفاظ میں یہی عشق و محبت ہے جو انسان کو عصیان سے اطاعت اور نافرمانی سے عبادت کی طرف لاتی ہے: الھی لم یکن لی حول فانتقل بہ عن معصیتك الا فی وقت أیقظتنی لمحبتك[14] یعنی: "بارالہا! میرے پاس کوئی چارہ نہیں کہ میں تیری نافرمانی چھوڑوں، مگر اُس وقت کہ جب تو اپنی محبت میں میری نیندیں اڑا دے۔" پس ایک عارف کی عبادت جذب و جنون کا سفر ہے جو "اَنانیّت" کے بت کی پوجا سے ہاتھ اٹھانے سے شروع ہوتا ہے، "للّٰہیت" کی وادی کی طرف بڑھتا ہے اور "فنا فی اللہ" کی منزل پر جا کر رکتا ہے: وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى

يَأۡتِيَكَ الۡيَقِيۡنُ (99:15) یعنی: "خدا کی بندگی کر تا کہ تجھے یقین حاصل ہو جائے۔" لہٰذا عرفان میں عبادت، عبد کا ربّ کی طرف واپسی کا سفر ہے جسے قرآن نے "رجوع الی اللہ" کا نام دیا ہے۔

قرآن کریم کی بیسیوں آیات نے واپسی کے اس سفر کو حتمی قرار دیا ہے: إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجۡعَىٰ (8:96) یعنی: "بے شک واپسی تیرے پروردگار کی طرف ہے۔" نیز ارشاد ہے: وَالۡمَوۡتَىٰ يَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ(36:6) یعنی: "اور اللہ مردوں کو محشور فرمائے گا پھر وہ اس کی طرف واپس لوٹائے جائیں گے۔" دنیا کی زندگی میں بقا نہیں اور خدا کا حکم یہ ہے کہ اس کی بارگاہ میں واپس لوٹ کر جانا ہے: كُلُّ شَيۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ لَهُ الۡحُكۡمُ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ(88:28) یعنی: "ہر چیز فنا ہونے والی ہے مگر اس کا مظہر؛ حکم اسی کا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے۔" لہٰذا یہ گمان باطل ہے کہ ہمیں بے مقصد خلق کیا گیا ہے اور واپسی نہ ہو گی: أَفَحَسِبۡتُمۡ أَنَّمَا خَلَقۡنَاكُمۡ عَبَثًا وَأَنَّكُمۡ إِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُونَ(115:23) یعنی: "آیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بے مقصد خلق کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤگے؟" پس انسان کی خدا کی طرف واپسی اور خدا سے ملاقات حتمی ہے: يَاۤاَيُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدۡحًا فَمُلٰقِيۡهِ (6:84) یعنی: "اے انسان! تو اپنے رب کی طرف مشقت سے سفر جاری رکھے ہوئے ہے تو اس سے تیری لقاء ضروری ہے۔"

عارفوں اور اہلِ سیر و سلوک کے مطابق، عبادت، لقاء اللہ کے لئے سفر اختیار کرنے کا نام ہے اور عابد وہ مسافر ہے جو پوری شجاعت کے ساتھ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ" (156:2) کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنی دنیاوی زندگی میں اپنی حرکت کا رُخ اپنے رب کی طرف موڑتا اور ببانگِ دہل اعلان کرتا ہے: إِنِّي وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالۡأَرۡضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِينَ(79:6) یعنی: "بے شک میں نے سیدھا اُس ہستی کا رُخ کر لیا ہے جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکین کی صف میں کھڑا نہ ہوں گا۔" عرفانی تصوّرِ کائنات میں انسانیت کا اعلیٰ ترین درجہ "نفخۂ الٰہی" ہے: وَنَفَخۡتُ فِيهِ مِن رُّوحِي(29:15) یعنی: "پھر اُس میں اپنی روح پھونک دوں۔" یہ آدمِ خاکی، افلاکی بھی ہے اور یہ مُلک، ملکوت سے وابستہ ہے۔ استاد مطہری کے بقول: "حقیقت یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت، "میں" کو پانا ہے۔ لیکن نہ "حیوانی میں" بلکہ حقیقی میں، ملکوتی میں۔ انسان اپنے آپ کو عبادت اور خدا کی یاد میں پاتا ہے۔"[15] لہٰذا بندگی میں انسان، عالمِ مُلک سے عالمِ ملکوت کی طرف عروج پانے کے لئے تگ و دَو کرتا ہے۔ اِس سفر میں خود خدا اس کی رہنمائی کرتا ہے: وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِينَ(69:29) یعنی: "اور جو لوگ ہماری راہ میں تگ ودَو کرتے ہیں ہم حتمی طور پر ان کی اپنے راستوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں

اور بے شک اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔" راہِ خدا کا سالک جب مکمل اطمینان، ارادے اور اختیار سے کوئے یار کی طرف مستانہ وار قدم بڑھاتا ہے تو اِس صعودی سفر میں اِس کا استقبال اِن الفاظ میں کیا جاتا ہے: يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (89:27-28) یعنی: "اے مطمئن نفس! اپنے پروردگار کی طرف اس حال میں واپس لوٹ آ کہ تو اُس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہے۔" اس کے برعکس، جو شخص مرتے دم تک غیر اللہ کی جانب بڑھتا رہے اور آخر دَم اُس کی ناک میں نکیل ڈال کر واپس لوٹایا جائے اُس کا ٹھکانہ ابدی جہنم ہوگا اور وہ وصال حق کی نعمت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناکام و نامراد رہے گا۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے الفاظ میں: خاب الوافدون علی غیرك و خسر المتعرضون الا لك" یعنی: "جو تیرے غیر کی جانب گئے وہ نامراد ٹھہرے اور جنہوں نے تیرے بناں کسی اور کا پیچھا کیا وہ گھاٹے میں رہے۔"

ان توضیحات کی روشنی میں اگر عابد کی حرکت "اَنا" سے "الہٰ" کی طرف نہ ہو، وہ عابد نہیں اور اگر کسی حرکت میں شوق و رغبت نہ ہو تو وہ عبادت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس راستے کے سالک، ہمیشہ خدا سے وہ شوق و رغبت اور جذب و جنون مانگتے ہیں جو اُن کے لئے قرب و وصال کی منزلگاہ کی طرف بڑھنے کا انگیزہ بن جائے: اشتاق الی قربك فی المشتاقین و ادنو منك دنوّ المخلصین[16] یعنی: "خدایا! مجھے ایسا بنا کہ میں عشاق کے قافلے کے ہمراہ تیری قربت کی تلاش میں نکلوں اور تجھ سے وہ قربت پالوں جو مخلصین کو حاصل ہے۔" عارفانِ حق یوں مناجات کرتے ہیں: الٰهی فاجعلنا من الذین ترسّخت اشجار الشوق الیك فی حدائق صدورهم و اخذت لوعة محبتك بمجامع قلوبهم فهم الی اوكار الافكار یاوون و فی ریاض القرب و المكاشفة یرتعون و من حیاض المحبّة بكاس الملاطفة یكرعون "[17] یعنی: "بارالہا! ہمیں اُن لوگوں میں قرار دے جن کے سینوں کے باغیچوں میں تیرے شوق کے درخت جڑیں پکڑ چکے ہیں اور تیری محبت کے سوز نے ان کے دلوں کے گھیرا ہوا ہے کہ عالی افکار کے آشیانوں میں پناہ لیتے اور تیرے قربت اور مکاشفہ کے باغوں میں سیر کر رہے اور محبت کے حوض سے الفت کے جام پی رہے ہیں۔" بنابریں، عارفانِ حق کے دل میں جب جمالِ مطلق کی تجلی کے تماشا کی یہ تڑپ ایجاد ہو جاتی ہے وہ کوہِ طور سے غارِ حرا کے درمیان ننگے پاوں راہ نوردی اور سعی کرتے اور "اَنا" کی زنجیروں کو توڑتے ہوئے "اَلحقّ" سے وصال کی تگ و دَو میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اِس مشقت بھرے سفر میں خدا کی محبت اُن کا توشہ راہ ہوتی ہے: وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ (2:165) یعنی: "اور جو ایمان لائے، ان کی اللہ سے محبت، ہر محبت سے شدید تر ہے۔"

؎ نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی   تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اَولیٰ!

پس عبادت، جو جنّ وانس کی تخلیق کی غرض و غایت اور دین جو رسمِ بندگی کی تعلیم کا نام ہے، سراسر عشق و محبت ہے۔ حضرت امام باقر علیہ السلام نے فرمایا: یا زیاد ویحك وهل الدین إلا الحب ، ألا ترى إلى قول الله : "إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم" أو لا ترى قول الله لمحمد صلى الله عليه و آله : "حبب إليكم الايمان وزينه في قلوبكم" وقال: "يحبون من هاجر إليهم" فقال: الدين هو الحب، والحب هو الدين[18] یعنی: "اے زیاد! وائے ہو تم پر! بھلا دین محبت کے سوا کچھ ہے؟ آیا تو نے اللہ کا فرمان نہیں سنا: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو کہ خدا تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔" آیا تو نے اللہ تعالیٰ کا حضرت محمد ﷺ سے یہ فرمان نہیں سنا: اس نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب اور اسے تمہارے دلوں میں مزین فرمایا ہے۔" اور فرمایا ہے: جو ان کی طرف ہجرت کرے ان سے محبت کرتے ہیں۔ پھر فرمایا: دین، محبت ہے اور محبت، دین ہے۔"

فضیل ابن یسار کا بیان ہے: سألت أبا عبد الله(ع) عن الحب والبغض، أمن الايمان هو؟ قال: وهل الايمان إلا الحب والبغض؟ ثم تلا هذه الآية "وحبب إليكم الايمان وزينه في قلوبكم، وكره إليكم الكفر والفسوق والعصيان أولئك هم الراشدون"[19] یعنی: "میں نے ابو عبداللہ (امام صادق علیہ السلام) سے محبت اور کینے کے بارے میں پوچھا کہ آیا یہ ایمان کا حصہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: تو کیا ایمان محبت اور کینے کے علاوہ کچھ ہے؟ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: اور اللہ نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت دے کر اُتارا ہے اور کفر و فسق و نافرمانی کو تمہارے لئے ناپسندیدہ بنا دیا ہے۔ یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔"

اگر ہم معصومین علیہم السلام کی دعاؤں اور مناجات پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں تو یہ جذب و وصل کی تمنا کی تجلی نظر آتی ہیں: فهبني--- صبرت على عذابك فكيف اصبر على فراقك--- واجعل لساني بذكرك لهجا وقلبي بحبّك متيّما یعنی: "فرض کریں --- میں تیرے عذاب پر صبر کر بھی لوں تو تیرے فراق پر کیسے صبر کروں گا؟--- اور میری زبان کو اپنی یاد سے گویا کر دے اور میرے دل کو اپنی محبت سے لبریز کر دے۔" کہیں عرض کرتے ہیں: ولا تحجب مشتاقيك عن النظر الى جميل رويتك یعنی: "اپنے حسین جلوے کے نظارے سے اپنے عاشقوں کو نہ روک۔" تو کہیں کہتے ہیں: ولقائك قرّة عيني ووصلك منى نفسي واليك شوقي وفي محبتك ولهي" یعنی: "اور تیری ملاقات میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور تیرا وصال میں سب سے بڑی آرزو ہے اور میرے شوق کا کعبہ تو اور تیری محبت میں میری ولہ ہے۔" تو کہیں عرض کرتے نظر آتے ہیں: ما اطيب طعم حبك وما اعذب شرب قربك"[20] یعنی: "تیری محبت کا ذائقہ کتنا طیب ہے اور تیرے قرب کی شراب کتنی میٹھی ہے۔"

امام خمینیؒ کے بیان کے مطابق لقاء اللہ کے مقام پر فائز ہونے کے قائلین کی مراد یہ ہے کہ: "تامّ و تمام تقویٰ کے حصول کے بعد اور تمام عوالم سے دل کے اعراض اور دنیا و آخرت سے بے نیاز ہونے کے بعد اور انیّت اور انانیّت کی پیشانی پر قدم رگڑنے کے بعد، اور حق تعالیٰ کے اسماء و صفات کی طرف مکمل توجہ کرنے کے بعد اور ذات مقدس کے عشق اور محبت میں غرق ہونے کے بعد اور قلبی ریاضتوں کے بعد سالک کے لئے ایک ایسی قلبی صفا ایجاد ہو جاتی ہے کہ جس میں اسماء و صفات الٰہیہ کی تجلی ظاہر ہوتی ہے اور عبد اور اسماء و صفات کے درمیان موجود حجاب پھٹ جاتے ہیں اور سالک اسماء و صفات میں فانی ہو جاتا ہے اور عزّ قدس و جلال کے ساتھ معلق ہو جاتا ہے اور ذاتی تام و تمام تدلّی پالیتا ہے اور اس حال میں سالک کی مقدس روح اور حق کے درمیان اسماء و صفات کے سوا کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔"[21]

؎ فارغ از خود شدم کوسِ انا الحق بزدم		ہمچوں منصور خریدار سر دار شدم من

مخالفت یا حمایت میں دلائل

عبادت کے عرفانی تصوّر کی بہت مخالفت کی گئی ہے، اِسے نادرست اور غلط قرار دیا گیا ہے اور عرفاء پر کفر و شرک اور زندقہ کے فتوے لگائے گئے ہیں۔ اس مقالہ میں ان فتووں کا جائزہ لینا مقصود نہیں۔ لیکن یہ بتانا مقصود ہے کہ جن لوگوں نے عبادت کے عرفانی تصوّر کی مخالفت کی ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ تصوّر انسان کے خدا سے اور خدا کے انسان سے محبت کے عقیدے پر استوار ہے۔ حالانکہ خداوند تعالیٰ انسان کے ادراک سے باہر ہے لہٰذا خدا سے عشق و محبت کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی طرح خدا کا اپنے بندوں سے عشق بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ عشق وہاں جنم لیتا ہے جہاں فراق اور ممانعت ہو۔ جہاں وصال اور تمکن ہو وہاں عشق معنی نہیں پاتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق، منجملہ انسان کی شہ رگ سے اس کے زیادہ قریب اور اُس پر مکمل اختیار اور تمکن رکھتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا اپنے عبد سے عشق و محبت بھی بے معنی ہے۔ اس کے علاوہ عبد اور معبود کے درمیان کوئی سنخیّت اور کوئی مناسبت نہیں کہ عبد و معبود کے درمیان عشق و محبت کا دَم بھرا جا سکے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ساتھ عشق و محبت کے رابطے جوڑنے کی باتیں کفر و شرک نہ بھی ہوں، کم از کم دیوانوں کی بڑ ہیں اور قرآن کریم یا معصومین علیہم السلام کے کلام میں الحب، الفراق، الرجوع، المُلاقَاة، الدنو، القرب، اور التدلّی جیسے کلمات بطورِ مجاز استعمال ہوئے ہیں اور ان سے بہشت کا شوق، جہنم کا خوف، عالمِ آخرت کی طرف بازگشت، بہشتی نعمتوں اور حوران جنّت وغیرہ سے ملاقات و معانقہ مراد ہیں۔

بادی النظر میں عرفان و عرفاء کی مخالفت میں وزن نظر آتا ہے۔ کیونکہ عرفاء کی باتیں عرفِ عام کے فہم میں آنے والی نہیں ہیں۔ خالق و مخلوق کے رابطے میں عوام کا فہم یہی ہے کہ خاک کو عالمِ پاک سے کیا نسبت؟ لیکن

سوال یہ ہے کہ بھلا خاک کا عالمِ پاک سے، عبد کا معبود سے، مخلوق کا خالق سے، حادث کا قدیم سے اور محتاج کا غنی سے رابطہ کیسے توڑا جاسکتا ہے؟ آیا یہ ممکن ہے کہ خاک، عالمِ پاک سے کٹ کر، مخلوق، خالق سے مستقل اور الگ رہ کر، حادث قدیم کے بغیر، ایک فقیرِ محض، غنیِ محض کے فیض سے بے نیاز ہو کر اور نادار، دارا کی عنایت کے بغیر باقی رہ سکیں؟ عقل و منطق کا فتویٰ یہی ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ قرآن و حدیث میں بھی اسی مطلب پر تصریحات موجود ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کو قیّومِ مطلق اور غنیِ مطلق قرار دیا گیا ہے اور مخلوقات کو فقیرِ محض قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خالق و مخلوق کے درمیان ایک آن اور آن سے بھی کمتر کے لئے رابطہ منقطع ہو جائے اور پروردگارِ عالم کی عالم سے عنایت ہٹ جائے تو پورا عالم نیست و نابود ہو جائے۔ بیسیوں روایات میں اس امر پر تصریح موجود ہے کہ اگر زمین پر ایک آن کے لئے بھی خدا کی حجّت نہ ہو تو زمین اہلِ زمین سمیت نابود ہو جائے گی: قال قلت لابی عبد الله علیه السلام: ا تبقی الارض بغیر امام؟ قال: لو بقیت الارض بغیر امام لساخت[22] یعنی: "راوی کہتا ہے میں نے امام صادق سے پوچھا: آیا زمین امام کے بغیر باقی رہ سکتی ہے؟ امام نے فرمایا: اگر زمین پر امام کا وجود باقی نہ رہے تو زمین نابود ہو جائے گی۔"

بنابریں، اگر خالق و مخلوق کے رابطہ کو دقیق نظر سے دیکھا جائے تو مخلوقات ہر آن اپنے خالق سے جڑی ہوئی اور اس کی قیّومیت کے سہارے قائم ہیں۔ لہٰذا انہیں خالق سے کاٹ کر دیکھنا نہ فقط قرآن و سنّت کی تعلیمات سے ناسازگار، بلکہ ایک مرحلہ پر شرک کا موجب بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ، جہاں "لقاء اللہ" پر ناظر آیات اور روایات کو مجاز پر حمل کرنا آسان نہیں، وہاں اربابِ سیر و سلوک کے کلام کو عرفی محاورات میں مراد لیے جانے والے معنوں پر حمل کرنا بھی مشکل اور بذاتِ خود غلط ہے۔ کیونکہ اگر ہم علم الاصول کے طے شدہ معیارات پر بات کریں تو عرفی محاورات میں انسان کے کلام میں اصالۃ الحقیقہ کا لفظی اصول لاگو ہوتا ہے۔ یعنی بنی نوعِ بشر کے کلام میں بنیادی قاعدہ یہ ہے کہ جب لوگ بات کریں اور اُن کے کلام میں مجاز گوئی کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو ان کے کلام سے حقیقی معنی مراد لینا چاہیے۔ مثال کے طور پر جب ایک شخص کہے "شیر آیا" اور اُس کے کلام میں مجاز گوئی کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو "شیر" کے لفظ سے درندہ حیوان کا معنی مراد لینا چاہیے نہ ایک شجاع انسان۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اور معصومینؑ کے کلام میں بھی اصالۃ الحقیقہ کا اصول لاگو ہوتا ہے۔ لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ اگر یہ کلام خالق کے بارے میں ہو تو اِس کے حقیقی معنی اور عرفی محاورات میں اِس سے مراد لیے جانے والا حقیقی معنی میں مکمل مطابقت نہ ہو گی۔ کیونکہ عرف اپنے الفاظ کے حقیقی معانی میں مادہ و مادیات اور جسم و جسمانیات کے لوازم کو جدا نہیں کرتا، حالانکہ مجردات میں ان لوازم کو ملحوظ خاطر رکھنا جائز نہیں ہے اور مادی و متناہی مخلوقات کے باہمی تعامل کے لئے وضع کیے جانے والے الفاظ اپنے عرفی معانی میں مجرد ولامتناہی کی توصیف میں کوتاہ ہیں۔

لہٰذا جہاں ان الفاظ کو حقیقی معنی پر حمل کرنا ضروری ہے، وہاں ان کے معانی کی مادہ ومادیات اور مخلوقات کے لوازم سے تجرید بھی ضروری ہے۔ ہمیں یہ اصول طے کر لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اور اولیائے الٰہی کے کلام الحب، الفراق، الرجوع، المُلاقَاۃ، الدنو، القرب، اور التدلی وغیرہ جیسے کلمات کو بنیادی طور پر اُن کے حقیقی معنی پر حمل کرنا ضروری ہے۔ ہاں ! یہ الگ بحث ہے کہ ان کا حقیقی معنی کیا ہے۔ لیکن بلا دلیل حقیقی معنی کی نفی اور کلام کو مجاز پر حمل کرنا غلط ہے۔ بدقسمتی سے کچھ لوگ ع "خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں" کے مصداق کے طور پر کلام اللہ اور اولیائے الٰہی کے کلام میں مستعمل مذکورہ بالا الفاظ کو بلاتامل مجازی معانی پر حمل کرتے ہیں۔ گویا اُن کے مطابق (نعوذ باللہ) خدا کے پاس میدانِ محشر، ثواب آخرت اور حور العین وغیرہ کے لئے الفاظ نہیں تھے۔ لہٰذا اُس نے میدانِ محشر میں لوٹائے جانے کے لئے " إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ" اور ثواب پانے کو "فَمُلَاقِيهِ" جیسے الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ اس بے راہ روی کا نتیجہ کیا ہے؟ امام خمینی کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ: "ہم اللہ کی معرفت کا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ ما رأیت شیئاً إلّا و رأیت اللّه قبله و معه و فیه کو آثار کی رویئت پر حمل کرتے ہیں۔ اور "لم أعبد ربّا لم أره" کو اپنے علوم جیسے کلی مفاہیم پر حمل کرتے ہیں۔ لقاء اللہ کی آیات کو روز جزا کی لقاء پر محمول کرتے ہیں۔ "لی مع اللّه حالة" کو قلب کی رقّت کی حالت پر حمل کرتے ہیں۔ اور "ارزقنی النّظر إلی وجهك الكريم" اور اولیاء کے درد فراق میں اُس عمیق سوز وگداز کو حور العین اور بہشتی پرندوں کے فراق پر حمل کرتے ہیں ! ہم ایسا محض اس لئے کرتے ہیں کہ ہم اس میدان کے مرد نہیں اور حیوانی اور جسمانی لذّتوں کے سوا کسی لذّت سے آشنا نہیں ہیں۔ لہٰذا ہم ان تمام معارف کا انکار کرتے ہیں۔" [23]

بنابریں، ہمیں عرفانی تعبیرات کو نہ مجازی معانی پر حمل کرنا چاہیے، نہ عرفِ عام میں مراد لیے جانے والے اُن معانی پر جو مادی چیزوں کی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ بلکہ اُن کے حقیقی معانی ہی مراد لینا چاہیں، لیکن وہ معانی جو مادہ اور جسم سے مجرد کے حسبِ حال ہوں۔ دراصل، اربابِ سیر و سلوک کے کلام میں اللہ تعالیٰ سے عشق و محبت کا دَم بھرنے کا معنی نعوذ باللہ یہ نہیں کہ عبد کو معبود پر ادراکی احاطہ حاصل ہو گیا ہے یا خالق و مخلوق کے درمیان کوئی سنخیّت پائی جاتی ہے کہ اسے شرک قرار دیتے ہوئے اہلِ عرفان کے کفر کا فتویٰ جاری کیا جائے۔ بعض اہلِ عرفان نے خود بڑی صراحت سے عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان ایسے رابطوں کی نفی کی ہے۔ ابو العباس ابن عریف سے منقول ہے کہ: لیس بینه و بین العباد نسب الا العنایة و لا سبب الا الحکم و لا وقت غیر الازل" [24] یعنی: "اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان (خدا کی) عنایت کے سوا کوئی نسبت نہیں ہے اور اُس کے حکم کے سوا کوئی سبب نہیں اور ازل کے سوا کوئی وقت نہیں ہے۔" اس حوالے سے امام خمینیؒ کی

عبارت یہ ہے: "یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ جن لوگوں نے لقاء اللہ اور جمال وجلال حق کے مشاہدے کا راستہ کھلا رکھا ہے، ان کی مراد یہ نہیں ہے کہ ذات مقدس حق کی کنہ تک پہنچنا ممکن ہے؛ یا حضوری علم اور عینی و روحانی مشاہدہ میں اُس علی الاطلاق محیط ذات کا احاطہ ممکن ہے۔ ایسا ہر گز نہیں۔ بلکہ عقلی تفکر کی بنیاد پر کلی علم کی روشنی میں ذاتِ مقدس حق کی کنہ تک رسائی کا ناممکن ہونا اور بصیرت کے قدم پر چل کر عرفانی مشاہدے کے ذریعے اس ہستی کے احاطہ کا امتناع اُن امور میں سے ہے جس پر برہان قائم ہو چکا ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر تمام عقلاء اور اربابِ معرفت و قلوب کا اتفاق ہے۔" [25]

یقیناً امام خمینی کا کلام حضرت امام صادق کے اُس نورانی کلام پر ناظر ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ امیر المومنین صلوات اللہ علیہ کے پاس ایک یہودی عالم آیا اور اُس نے پوچھا: یا أمیر المؤمنین هل رأیت ربك حین عبدته؟ قال: فقال: ویلك ما کنت أعبد ربا لم أره، قال: وکیف رأیته ؟ قال: ویلك لا تدرکه العیون فی مشاهدة الابصار ولکن رأته القلوب بحقائق الایمان[26] یعنی: "اے امیر المومنین! آیا آپ نے عبادت کے دوران اپنے ربّ کو دیکھا ہے؟امام صادقؑ نے فرمایا کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا: وائے ہو تم پر، میں ایسے رب کی عبادت کرنے والا نہیں ہوں جسے میں نے دیکھا نہ ہو۔ حبر نے پوچھا: آپ نے کیسے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ فرمایا: وائے ہو تم پر، اسے آنکھیں نظروں کے مشاہدہ میں نہیں پا سکتیں، لیکن دل ایمان کی حقیقت کے ذریعے دیکھ سکتے ہیں۔"

ان تصریحات کی روشنی میں یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اہل عرفان کے کلام میں عشق، محبت، خال، بال، عارض، آنکھ، حسن، شراب اور کیف و مستی غرضیکہ کوئی اصطلاح اللہ تعالیٰ کے ذات کی تنقیص، تجسیم یا تناہی کے معنی و مفہوم میں نہیں ہے اور نہ اِس سے عبد کا معبود اور مخلوق کا خالق پر علمی احاطہ مراد ہے۔ بلکہ خالقِ ہستی کے کمالِ مطلق کی توصیف میں جہاں کہیں خالِ لب، گیسوئے پیچ دار، چشم بیمار، حسن یار اور مئے و مستی کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں تو یہ از روئے اضطرار، کنایہ اور مجاز استعمال ہوئی ہیں۔ کیونکہ خالق کے بارے میں مخلوق کے کلام سے عرفِ عام کے حقیقی معنی مراد نہیں لیے جا سکتے۔ لہٰذا اِن تعبیرات کے ہر اُس معنی و مفہوم سے ذاتِ احدیّت کے کمالِ مطلق کی تنزیہ ضروری ہے جس سے تجسیم و تناہی کی بو آتی ہو یا عبد کے معبود اور مخلوق کے خالق پر علمی احاطہ کا شائبہ ایجاد ہوتا ہو۔ دراصل، فکرِ بشر کی یہی درماندگی کا عالم یہ ہے کہ اُسے نماز جیسی توقیفی عبادت میں بھی اللہ تعالیٰ کی ہر توصیف کے بعد تکبیر کی تلقین کی گئی ہے اور ہر ثناء میں حمد کے ساتھ تسبیح، تقدیس اور تنزیہ کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ متناہی کے لامتناہی کی مدح سرائی میں کم مایئگی کا یہ اعتراف عام انسانوں کے کلام میں تو کجا، حضرات معصومین علیہم السلام کی مناجات میں بھی واضح نظر آتا ہے: الهی لولا القبول من قبول امرك لنزهّتك

من ذکری ایّاك علی انّ ذکری لك بقدری لا بقدرك[27]یعنی: "بارالہا! اگر تیرا امر قبول کرنا لازم نہ ہوتا تو میں تجھے اپنے ذکر سے منزہ قرار دیتا۔ کیونکہ میرا، تیرا ذکر بجا لانا، میری وسعت کے مطابق ہے، تیری شان کے مطابق نہیں ہے۔"

خلاصہ یہ کہ عرفاء، لقاء اللہ سے کوئی ایسا معنی مراد نہیں لیتے جس سے تناہی، تجسیم اور تشبیہ کی بو آتی ہو۔ تاہم وہ ایسی تعبیرات سے ایسے مجازی معانی بھی مراد نہیں لیتے جو اہلِ ظاہر مراد لیتے ہیں۔ بلکہ ان کے مطابق: "بعض اہلِ سلوک کے لئے یہ عین ممکن ہے کہ اُن کے لئے اسماء و صفات الٰہی کے نورانی حجاب بھی الٹ جائیں اور وہ ذاتِ غیبی کی تجلیات دیکھیں اور خود کو ذاتِ مقدّس الٰہی کے ساتھ معلّق اور متدلّی دیکھیں اور اِس مشاہدہ میں اپنی ذاتی فنا اور حق تعالیٰ کے قیّومی احاطہ کا مشاہدہ کریں۔۔۔ مناجات شعبانیہ میں جو کہ علماء کے لئے قابل قبول ہے اور خود اپنے اولیائے الٰہی کا کلام ہونے پر گواہ ہے، معصوم بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے ہیں: الھی ھب لی کمال الانقطاع إلیك، وأنیرابصار قلوبنا بضیاء نظرھا إلیك، حتی تخرق ابصار القلوب حجب النور، فتصل إلی معدن العظمة وتصیرأرواحنا معلقة بعز قدسك، الھی واجعلنی ممن نادیته فاجابك ولاحظته فصعق لجلالك فناجیته سرّا وعمل لك جھرا[28] یعنی: "الٰہا! مجھے اپنی طرف کمال کا انقطاع عطا فرما اور ہمارے دلوں کی نظروں کو اپنی طرف دیکھنے کی ضیاء سے منور فرما یہاں تک کہ دلوں کی نظریں نور کے حجاب چیر کر عظمت کی معدن تک جا پہنچیں اور ہماری ارواح تیرے قدس کی عزت کے ساتھ معلق ہو جائیں۔ بارالہا! اور مجھے ان لوگوں میں قرار دے جنہیں تو نے ندا دی تو انہوں نے اجابت کی اور تو نے انہیں ملاحظہ فرمایا تو وہ تیرے جلال کے صاعقہ میں گرفتار ہوئے پس تو نے اس سے مخفیانہ طور پر مناجات کی اور اس نے تیرے لئے اعلانیہ عمل انجام دیا۔"[29]

نتیجہ گیری

اس مقالہ کی تمام مباحث کا نتیجہ یہ ہے کہ دین ایک آسمانی اور وحیانی حقیقت ہے لیکن دینداری ایک بشری کیفیت اور تصورِ کائنات ہے۔ انسان کی فطرت میں دین کی قبولیت کا جاودانی تقاضا بطور اتم موجود ہے۔ عبادت، درحقیقت، معبود کی معرفت، عمل کی محض خدا کے لیے انجام دہی اور شریعت میں اپنی مرضی اور معیار کے احکام داخل کرنے سے مکمل پرہیز کا نام ہے۔ جس عمل میں یہ تین بنیادی خصوصیات پائی جاتی ہوں وہ عبادت ہے اور یقیناً اُس پر عابد، معبود کی بارگاہ سے اجر و ثواب کا مستحق ہے، تاہم عبادت کی روح، عرفان میں پوشیدہ ہے۔

*****

حوالہ جات

1- بہشتی، احمد، *فلسفہ دین*، (قم، بوستان کتاب، 1382ھ،ش) 34-35۔
2- عبداللہ، جوادی آملی، *دین شناسی*، تحقیق و تنظیم، محمد رضا مصطفیٰ پور، (قم، مرکز نشر اسراء، 1381ھ،ش) 27۔
3- محمد رضا، اسدی، *مقدمہ کتاب فلسفہ دین* (دفتر نخست)، (قم، مؤسسہ فرہنگی اندیشہ، 1375ھ،ش) 17۔
4- جوادی آملی، *دین شناسی*: 27۔
5- مہدی، ہادوی تہرانی، *ولایت و دیانت* (تہران، مؤسسہ فرہنگی خانہ خرد، 1381ھ،ش) 17۔
6۔ *نہج البلاغہ*، تحقیق محمد عبدہ، ج4 (قم، دار الذخائر، 1412ھ،ق) 53۔
7۔ لجنۃ الحدیث فی معھد باقر العلومؑ، *موسوعۃ کلمات الامام الحسینؑ* (قم، دار المعروف للطباعۃ والنشر 1416ھ،ق 1995ء) 948۔
8۔ غلام حسین، ابراہیمی دینانی، *دفتر عشق وآیت عقل* (تہران، طرح نو، 1380ھ،ش) :61؛ بنقل از رسالۂ ضوء اللمعات صائن الدین ترکہ: 5۔
9۔ محمد، محمد الریشہری، *موسوعۃ الامام علی بن ابی طالب* (ع) فی الکتاب والسنۃ والتاریخ، ج: 9 (قم، دار الحدیث للطباعۃ والنشر، 1425ھ،ش) 203۔
10۔ الکافی، ج1، ص98۔
11۔ محمد باقر، المجلسی، *بحار الانوار*، ج: 84 (بیروت، داراحیاء التراث العربی، 1403 - 1983م) 199۔
12۔ روح اللہ، خمینی، *شرح چہل حدیث* (تہران، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، 1371ھ،ش) 156-158۔
13 ۔ دینانی، ص66۔
14۔ علی، ابن الطاوس، *اقبال الاعمال*، ج3، تحقیق: جواد القیومی الاصفہانی (قم، مکتب الاعلام الاسلامی؛ 1416ھ،ق) 298۔
15۔ مرتضی، مطہری، *فلسفہ اخلاق* (تہران، انتشارات صدرا، 1367ھ،ش) 175۔
16۔ عباس، قمی، *مفاتیح الجنان* (قم، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، 1371ھ،ش) دعائے کمیل۔
17۔ عباس، قمی، *مفاتیح الجنان* (قم، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، 1371ھ،ش) مناجاۃ العارفین۔
18۔ ایضا، ص263۔
19۔ الشیخ الکلینی، *الکافی*، ج:2 ، تصحیح و تعلیق علی اکبر غفاری، (تہران، دار الکتب الاسلامیۃ، 1365 ھ،ش) 125۔
20۔ عباس، قمی، *مفاتیح الجنان* : دعائے کمیل، مناجاۃ الخائفین، المریدین، العارفین۔
21۔ روح اللہ، خمینی، *شرح چہل حدیث* (تہران، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، 1371ھ،ش) 454۔
22۔ اصول کافی، ج1، ص179۔
23۔ ایضا: 456۔

24۔ابراہیمی دینانی، ،دفتر عشق وآیت عقل : 70۔
25۔روح اللہ، خمینی،شرح چہل حدیث (تہران، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، 1371ھ،ش):453۔
26۔الکافی،ج1، ص98۔
27۔عباس، قمی،مفاتیح الجنان، مناجات الذاکرین۔
28۔ابن الطاووس،إقبال الأعمال،ج3 :299۔
29۔روح اللہ، خمینی،شرح چہل حدیث (تہران، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، 1371ھ،ش) 454۔

کتابیات

1) احمد، بہشتی،فلسفہ دین، قم، بوستان کتاب، 1382ھ،ش۔
2) جوادی آملی، عبداللہ، دین شناسی، تحقیق و تنظیم، محمد رضا مصطفیٰ پور، قم، مرکز نشر اسراء، 1381ھ،ش۔
3) اسدی، محمد رضا،مقدمہ کتاب فلسفہ دین ، قم، مؤسسہ فرہنگی اندیشہ، 1375ھ،ش۔
4) ہادوی تہرانی، مہدی، ولایت و دیانت، تہران، مؤسسہ فرہنگی خانہ خرد، 1381ھ،ش۔
5) امیر المومنین، الامام علیؑ،نہج البلاغہ ،تدوین سید رضی، تحقیق محمد عبدہ، قم، دار الذخائر 1412ھ،ق۔
6) لجنتہ الحدیث فی معہد باقر العلومؑ،موسوعۃ کلمات الإمام الحسینؑ، قم، دار المعروف للطباعۃ والنشر 1416ھ،ق 1995ء۔
7) ابراہیمی دینانی، غلام حسین،دفتر عشق وآیت عقل، تہران، طرح نو، 1380ھ،ش۔
8) محمد الریشہری، محمد،موسوعۃ الإمام علی بن ابی طالب (ع) فی الکتاب والسنۃ والتاریخ، قم، دار الحدیث للطباعۃ والنشر، 1425ھ،ش۔
9) المجلسی، محمد باقر،بحار الأنوار، بیروت، دار إحیاء التراث العربی، 1403 - 1983م۔
10) خمینی، روح اللہ، تہران، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، 1371ھ،ش۔
11) ابن الطاووس، علی،إقبال الأعمال، قم، مکتب الإعلام الإسلامی؛ 1416ھ،ق۔
12) مطہری، مرتضی،فلسفہ اخلاق، تہران، انتشارات صدرا، 1367ھ،ش۔
13) قمی، عباس،مفاتیح الجنان، قم، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، 1371ھ،ش ۔
14) الکلینی، محمد یعقوب، الکافی، تصحیح و تعلیق علی اکبر غفاری، تہران، دار الکتب الإسلامیۃ، 1365ھ،ش۔